داغ وامیر:رام پور میں

ڈاکٹر لیاقت علی

صدر شعبہ اردو(ریٹائرڈ)، گورنمنٹ کالج ٹاؤن شپ لاہور

Abstract:

In this paper the relation of Dagh and Ameer with Ram Pur has been elaborated. Dagh Dehlvi and Ameer Minai mirgrated to Ram Pur from their native cities. There was a healthy competition among these popular poets in the state. Both were employees and had great time at the peaceful place. Ram Pur was the place where hidden qualities of both the leading poets were revealed. In their earlier works at their own schools, i.e. Delhi and Lucknow respectively. A drastic change can be witnessed in their verses written at Ram Pur. So we can say That Dagh and Ameer were influenced by the literary environment of Ram Pur and contributed a lot in making the place a 3rd school of poetry alongside Delhi and Lucknow as well.

Keywords:

رام پور(Ram Pur)، روایت(Riwayat)، قلعہ معلّٰے(Qila Mualah)، فارغ البالی(Farig-ul-Bali)، شہر آشوب(Shar-e-Ashob)، قصائد(Qsaid)، شوخئ فکر(Shokhi-e-Fiker)، کمالِ فن(Kamal-e-Fun)

داغ دہلوی:

نواب مرزا خاں داؔغ ۲۵۔ مئی ۱۸۳۱ء کو دہلی کے محلّہ 'چاندنی چوک' میں پیدا ہوئے۔ والدہ کا نام وزیر بیگم اور عُرف چھوٹی بیگم تھا جو محمد یوسف کشمیری سادہ کار کی بیٹی تھیں۔ نواب شمس الدین خاں فیروز پور جھرکہ کے جاگیر دار تھے۔ روایت ہے کہ داغ کی والدہ اُن کے حرم میں تھیں۔ لیکن غیر منکوحہ ہونے کے باعث نہ تو داغ نواب مذکور کے وارث کہلائے اور نہ نواب احمد بخش خاں (داغ کے دادا) کے خاندان نے اُنھیں اپنایا۔ امیر مینائی(۱) نے سب سے پہلے نواب شمس الدین خاں کو داغ کا والد لکھا ہے:

> "داؔغ نواب مرزا خاں خلف نواب شمس الدین خاں مغفور، چوالیس برس کی عمر میں صاحبِ دیوان، شیخ محمد ابراہیم ذوق دہلوی کے شاگردوں میں فردِ کامل خوش مذاق ہونے میں یکتائی حاصل۔"

۱۸۔ اکتوبر ۱۸۳۵ء کو دہلی کے ریذیڈنٹ ولیم فریزر کے قتل میں اعانت کے جُرم میں نواب شمس الدین خاں کو پھانسی دے دی گئی۔ دآغ ابھی چار برس کے تھے۔(۲)

"اب یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ داغ ۱۸۳۵ء اور ۱۸۴۴ء کے درمیان کہاں رہے؟ ہماری رائے میں چھوٹی بیگم کی لااُبالی طبیعت سے یہ بعید نہیں کہ اُس نے اِس سیاہ فام بچے کو اپنے ساتھ نہ رکھا ہو گا؛ اس عرصے میں پہلے انگریز طالب مارسٹن بلاک کے ساتھ ایام گزاری کی اور اس سے چھوٹ کر آغا تراب علی کے گھر کی زینت بنی، داغ اپنے ننھیال میں رہتے رہے۔"

دآغ اپنے بچپن کے ساتھ اساتذہ میں مولوی غیاث الدین رامپوری اور سید احمد حسین دہلوی کے نام لیتے ہیں۔ گیارہ سال کی عمر میں اُن کا اپنی خالہ عمدہ بیگم کے ساتھ رام پور جانا بعید از قیاس نہیں بقول فائق رامپوری:(۳)

"اب رہ جاتی ہے مولوی غیاث الدین کی شاگردی؛ اگر داغ کی روایت سچی ہے تو اگست ۱۸۴۰ء اور ۱۸۴۴ء کے مابین یہ ماننا ہو گا کہ داغ اپنی خالہ عمدہ خانم کے ہمراہ دس گیارہ سال کی عمر میں رام پور پہنچے اور کچھ سبق فارسی کی کتابوں کے مولوی غیاث الدین سے پڑھے ہوں اور اسی بنا پر اپنے غیر معروف اساتذۃ کا تذہ کا ذکر نظر انداز کر کے صرف دو استادوں مولوی غیاث الدین رام پوری اور سید احمد حسین دہلوی سے تعلیم حاصل کرنے کا بیاں لکھا دیا ہو۔"

آغا تراب علی کے انتقال کے بعد ۱۸۴۴ء میں چھوٹی بیگم، بہادر شاہ ظفر کے ولی عہد مرزا فخرو کے حرم میں پہنچ گئیں اور داغ بھی اُن کے ہمراہ قلعۂ معلیٰ میں چلے آئے۔ یہاں آکر اُنھوں نے مولوی سید احمد حسین سے تعلیم پائی۔ اُس وقت داغ کی عمر چودہ برس تھی۔ مرزا فخرو نے اُنھیں موزوں طبع پا کر استاد ذوقؔ کے حوالے کر دیا۔ مشقِ سخن کے ساتھ ساتھ دآغ نے قلعہ معلّٰی میں رہ کر خوش نویسی، سپہ گری، پھکیتی (گتکابازی) شہ سواری، تلوار زنی اور نشانہ بازی کے ہنر بھی سیکھے۔

ولی عہد مرزا فخرو کی سرپرستی میں فارغ البالی نصیب ہوئی تو دآغ کی شادی اُن کی خالہ زاد، فاطمہ بیگم سے کر دی گئی۔ قلعۂ معلیٰ میں اُنھیں ہر طرح کا عیش و آرام میسّر تھا۔ سولہ برس کی عمر میں سنجیدگی کے ساتھ شاعروں کی طرف متوجہ ہوئے۔ ۱۸۴۶ء کے لگ بھگ اُنھوں نے نواب مصطفےٰ خاں شیفتہ کے مشاعرے میں غزل پڑھی جس کا مطلع ہے۔(۴)

شرر و برق نہیں، شعلہ و سیماب نہیں　　کس لیے پھر یہ ٹھہرتا، دل بیتاب نہیں

"اس مشاعرے میں غزل پڑھنے کے بعد پھر تو یہ حالت ہو گئی کہ جہاں کسی معزز مشاعرے کا ذکر سنا اور پہنچے۔ بات یہ تھی کہ سوائے فارغ البالی اور اطمینان اور ابتدائی زمانے کے اس وقت کے لوگ اور اس زمانے کی طبیعتیں ایسی انصاف پسند اور مصنف مزاج تھیں کہ اگر کسی مشاعرے میں کوئی معمولی بچہ بھی غزل پڑھتا تو اس کو اس قدر دادِ سخن دی جاتی تھی کہ خواہ مخواہ ہر مشاعرے میں جانے کو اس کا جی چاہتا تھا۔"

داؔغ نے سخن گوئی کا آغاز کیا تو ذوقؔ، مومؔن، غالبؔ، آزرؔدہ، عیشؔ، وحشتؔ اور شیفتہؔ جیسے اساتذۂ فن موجود تھے۔ اُن کے ہم عصروں میں مہدی مجروحؔ، سید شجاع الدین انورؔ، مرزا قربان بیگ سالکؔ، مولوی عبدالکریم سوز، غلام مولیٰ قلقؔ، شہزادہ صاحب اشکیؔ، پیارے صاحب شہرت، مرزا قادر بخش صابرؔ، آغا مرزا شاغلؔ (برادرِ خورد داؔغ) شامل تھے۔ یہ لوگ ہر شام یکجا ہو کر باہم دادِ سخن دیتے تھے مگر شومیِ قسمت سے یہ جلسہ بھی قائم نہ رہ سکا۔(۵)

"عیش و نشاط کی محفل جلد ہی برہم ہو گئی، مرزا فخر و ولی عہد سلطنت کے دم سے یہ جلسۂ عیش قائم تھا، ۱۰۔ جولائی ۱۸۵۶ء کو ہیضے کی بیماری سے دینائے فانی سے رخصت ہوئے۔"

ابھی اِس صدمے سے باہر نہ آئے تھے کہ داؔغ اور اس کے خاندان کو ۱۸۵۷ء کے باعث دہلی سے رخصت ہونا پڑا۔ اس سانحے کی کیفیت اُن کے شہر آشوب سے ظاہر ہوتی ہے۔

برنگِ بوے گل، اہل چمن سے چلے　　غریب چھوڑ کے اپنا وطن، وطن سے چلے

نہ پوچھو زندوں کو، بے چارے کس چلن چلے　　قیامت آئی کہ مُردے نکل کفن سے چلے

مقامِ امن جو ڈھونڈا تو راہ بھی نہ ملی　　یہ قہر تھا کہ خدا کی پناہ بھی نہ ملی

اکتوبر یا نومبر ۱۸۵۷ء میں داؔغ مع اہلِ خانہ رام پور چلے گئے۔ داؔغ کی والدہ چھوٹی بیگم، خالہ عمدہ بیگم، اہلیہ فاطمہ بیگم، آغا مرزا شاغل اور خورشید عالم سبھی اُن کے ہمراہ تھے عمدہ خانم نواب یوسف علی خاں کی منظورِ نظر تھیں۔(۶)

"داؔغ کو نواب یوسف علی خاں نے بطور مہمان رکھا، عمدہ خانم وظیفہ خوار تھیں، اس طرح آرام سے دِن گزرنے لگے۔"

داؔغ مہمان کی حیثیت سے رہتے تھے مگر کاروبارِ ریاست میں اُن سے کچھ خدمات بھی لی جاتی تھیں۔ نواب ذاتی کاروبار کے سلسلے میں اُنھیں مختلف شہروں میں بھیجتے تھے اور یہ سلسلہ نواب یوسف علی خاں ناظمؔ کی وفات ۲۱۔ اپریل ۱۸۶۵ء تک جاری رہا۔ نواب کلب علی خاں کی مسند نشینی کے بعد داؔغ نے ملازمت کے لیے درخواست گزاری جو منظور ہوئی اور ۱۴۔ اپریل ۱۸۶۶ء کو ستر (۷۰) روپے ماہانہ تنخواہ پر اُن کا تقرر ہوا۔(۷)

"نواب مرزا خاں داؔغ کہ مدِّ مصاحبانِ شاعران میں ملازم تھے اور کا منصرمی اصطبل سرکاری اور فرازش خانے کا بھی اُن سے متعلق تھا۔ یہ قوی ہیکل اور سیاہ فام تھے۔ اور شید بود کا علم بھی رکھتے تھے۔"

۱۸۵۷ء میں داؔغ رام پور آئے تو یہاں کا ادبی ماحول ایک واضح رُخ اختیار کر چکا تھا جو دہلی اور لکھنؤ سے بہت حد تک مختلف تھا۔ دہلی گذشتہ ایک صدی سے آفات کا مسکن بن چکا تھا جبکہ لکھنؤ خوشحالی اور نشاط افزا محفلوں کا مرکز تھا۔ دہلی خانقاہی مزاج کا حامل تھا اور لکھنؤ عیش و عشرت کی جولاں گاہ۔ اس دور میں دبستانِ رام پور اپنے پہلے حکمران فیض اللہ خاں کی متین شخصیت اور پٹھانوں کے مخصوص طرزِ نعاشرت کی بدولت ایک متوازن اور معتدل ادبی مذاق پیدا کر چکا تھا۔ ۱۸۵۷ء تک آتے آتے اگرچہ یہاں بھی دوسرے شہروں کی طرح کسی قدر آزادی اور عیش کوشی کا چلن ہو گیا تھا تاہم پٹھانوں کے مخصوص مذہبی رجحان کے سبب اس معاشرے میں کوئی نمایاں تبدیلی نہیں آئی تھی۔ داؔغ محض ۲۶ سال کے تھے کہ وہ ریاست رام پور کے مہمان ہوئے اور اس کے بعد ۱۸۸۷ء تک تقریباً ۳۰ برس اُن کا یہاں قیام رہا۔ ۱۸۵۶ء میں جلاؔل لکھنوی بھی اتنی عمر میں ریاست مذکور کے ملازم ہوئے۔ امیر مینائی نواب یوسف علی خاں کے عہد میں آ کر نوکر ہوئے تو اُن کی عمر بھی ۳۰ برس سے زیادہ نہ تھی۔ لہٰذا اس نئے ماحول میں ان شعراء کا ڈھل جانا اور یہاں کے ادبی مذاق سے متاثر ہونا ایک فطری عمل تھا۔ یہاں آ کر ان شعرا میں مسابقت کی فضا قائم ہوئی اور انھوں نے اپنی صلاحیت کو نکھارا۔(۸)

"حقیقت یہ ہے کہ ان تینوں حضرات کو قیام رام پور کے دوران وہ عظمت نصیب ہوئی کہ بیسیوں مقامی اور غیر مقامی نوجوان شعرا ان کے شاگرد ہوئے اور آج ہم سب انھیں عزت اور احترام کے ساتھ یاد کرتے ہیں۔"

ناقدینِ سخن نے عام طور پر یہ رائے قائم کی ہے کہ داغ اور امیر کے آجانے سے رام پور کا دبستانِ شاعری وجود میں آیا لیکن حقائق اس سے کچھ مختلف ہیں۔۱۸۵۷ء سے ۸۰ برس پہلے شیخ قیام الدین قائم، نواب محمد یار خاں امیرؔ، قدرت اللہ شوقؔ، عنبر شاہ آشفتہؔ، کبیرؔ، آشناؔ اور عبرت وغیرہ اور اُن کے شاگردوں کی کوشش سے رام پور کی شاعری کا ایک واضح رنگ سامنے آچکا تھا۔ اس رنگ میں دہلی اور لکھنؤ کے اساتذہ مثلاً غالبؔ و مومنؔ اور مصحفی و جراتؔ کے شاگردوں کی جھلک بھی صاف نظر آتی تھی۔ داؔغ کی شہرت نے جہاں رام پوری شعرا کو تحریک دی وہاں خود اُن کی شاعری میں بھی نکھار آتا گیا۔(۹)

> " رام پور میں بہت جید علماء شعرا اور کاملین فن کا اجتماع ہو گیا تھا۔ اسیرؔ، فلکؔ، جلالؔ، امیرؔ مینائی اور بیسیوں لکھنوی اور دہلوی شعرا نواب رام پور سے وابستہ ہو گئے۔ ظاہر ہے کہ ایسی فضا میں شعرا ایک دوسرے سے بڑھ چڑھ کر شعر کہنے کی کوشش کرتے تھے۔ امیر مینائی اور داؔغ کی ہم طرح غزلیں اس بات کا ثبوت ہیں کہ رام پور کے دربار سے منسلک شعرا ایک ہی زمین میں اپنا کمال اور انفرادیت دکھانے کی کوشش کرتے تھے۔"

داؔغ ۱۸۶۶ء میں ریاست کے مستقل ملازم ہو گئے تو انھوں نے اپنے قیام دہلی کے لکھے ہوئے دیوان گلزار داغ پر نظر ثانی کی۔ اُن کی ایک غزل کا مشہور مطلع

شرر و برق نہیں، شعلہ و سیماب نہیں　　کس لیے پھر یہ ٹھہرتا، دل بیتاب نہیں

گلزارِ داؔغ سے خارج ہو گیا۔ اس کی جگہ داغ نے یہ مطلع شامل کیا:

بیکسی! صدمۂ ہجراں کی مجھے تاب نہیں　　کاش دشمن ہی چلے آئیں جو احباب نہیں

یہ عمل ظاہر ہے کہ رام پور کے ماحول سے متاثر ہو کر کیا گیا اور داؔغ کی طبیعت میں جو متانت آئی تھی اُس کی تاثیر کلام میں شامل ہونے لگی۔ عام طور پر نقاد اُن کی شاعری کو محض معاملہ بندی اور وقوع گوئی کا طعنہ دے کر مبتذل قرار دے دیتے ہیں مگر حقیقتیہ ہے کہ داؔغ کا عورت کے معاملے میں یہ رویہ اُن کے نفسیاتی اور سماجی پس منظر میں دیکھنا ضروری ہے۔ اُس نے جس ماحول میں پرورش پائی وہ اس بات کا مقتضی تھا کہ عورت کو وہ محترم نہ گردانے۔ بچہ ماں

ہی کو معیاری عورت تصور کرتا ہے اور اس کی تمثال خیال دل میں لیے پھرتا ہے۔اس معاملے میں داؔغ خوش نصیب نہ تھا؛چنانچہ اُس عورت کے احترام کی امید نہیں کی جاسکتی۔

داغ کی زندگی میں منّی بائی حجاب کا عشق بھی خاص اہمیت رکھتا ہے۔۱۸۷۹ء میں بے نظیر باغ(رام پور)کے میلے میں داؔغ کی اُس سے ملاقات ہوئی مگر چند روز التفات کرکے حجاب کلکتہ واپس چلی گئی۔اِس دوران میں داؔغ التجا بھرے خط لکھتے رہے اور ۱۸۸۰ء کے میلے میں اُنھیں بُلانے میں کامیاب ہوگئے مگر ستم یہ ہوا کہ منی بائی حجاؔب نواب حیدر علی خاں(برادر نواب کلب علی خاں)کی مہمان بن گئیں۔داؔغ نے جوں توں اُسے اپنے گھر بُلانے کا انتظام کرہی لیا مگر یہ ملاقات بھی دو تین روز سے زیادہ نہ چل سکی۔حجاؔب واپس چلی گئی اور اگلے سال نہ آئی۔بے قرار ہوکر داؔغ اپریل ۱۸۸۲ء میں کلکتے کی طرف روانہ ہو گئے۔جون۔۱۸۸۲ء میں نواب کلب علی خاں کے تقاضے پر واپس چلے آئے۔قیامِ کلکتہ میں اُنھوں نے جو کچھ دیکھا وہ اس شعر سے عیاں ہے۔

کیا رہیں ہم کہ ترا شال چلن　　پاس رہ کر نہیں دیکھا جاتا

عشق کے اس بھرپور تجربے کو داؔغ نے اپنی مشہور مثنوی،فریادِ داغ،میں قلم بند کیا۔۱۸۸۰ء میں حجاؔب کی دوسری مرتبہ آمد کا منظر یوں بیان کرتے ہیں۔

جا کے عہدِ شباب کا آنا　　تھا دوبارہ حجاب کا آنا

پھر وہی ساعتِ سعید آئی　　کہ برس دِن کے بعد عید آئی

داؔغ کے نقادوں میں اکثریت ایسے ناقدین کی ہے جو اُن کے بارے میں قطعی فتویٰ دے کر کلامِ داؔغ کو شجرِ ممنوعہ قرار دینے کی کوشش کرتے ہیں۔ہاشمی(۱۰)لکھتے ہیں۔

>"داؔغ سے ان کی"چھین جھپٹ"لے لیجے تو وہ کورے رہ جاتے ہیں۔خود اُن کے بڑھاپے کی شاعری محض لغت تراشی اور محاورہ بندی ہے۔"

یہ دونوں باتیں محلِ نظر ہیں۔داؔغ کے ہاں صرف'چھین جھپٹ' ہی نہیں بلکہ اردوپن،کی ایسی عمدہ مثالیں بھی ہیں کہ شاید ہی کہیں ڈھونڈے سے مل پائیں۔

ایک مثال دیکھیے:

ابھی ہماری محبت کسی کو کیا معلوم کسی کے دل کی حقیقت کسی کو کیا معلوم
یقیں تو یہ ہے وہ خط کا جواب لکھیں گے مگر نوشتہء قسمت کسی کو کیا معلوم
بہ ظاہر اُن کو حیادار لوگ سمجھیں ہیں حیا میں ہے جو شرارت کسی کو کیا معلوم

ایک اور غزل کے تین اشعار بھی قابل غور ہیں:

لذتِ سیر دگر چشمِ تمنا لے گی ایک بار اور بھی دُنیا ابھی پلٹا لے گی
نہ کریں میرے لیے حضرتِ ناصح تکلیف خود طبیعت دلِ بے تاب کو سمجھا لے گی
ایک مدت سے ہے برباد ہماری مٹی دیکھیے کب ترے دامن کا سہارا لے گی

اب رہا معاملہ آخری عمر کی 'لغت تراشی' کا تو داغ کے وہ قصائد پیش کیے جاسکتے ہیں جو اُنھوں نے قیامِ دکن کے زمانے میں نظامِ دکن کی شان میں لکھے۔ نواب میر محبوب علی خاں نظام الملک کی مدح میں لکھے ہوئے قصیدے کے چند اشعار بطور نمونہ درج کیے جاتے ہیں:

کیا جواں بخت و جواں سال ہوا ہے عالم
فلک پیر بھی کھاتا ہے جوانی کی قسم
مطلع ثانی صاحب طبل و علم مالک شمشیر و قلم
میر محبوب علی خاں شہِ فرخندہ شیم
مالکِ مملکت و مال و منال و مکنت
صاحب دبدبہ و طنطنہ و جاہ و حشم
مطلع ثالث کیا عجب ناموری سے تری اے بحرِ کرم

فلسِ ماہی پہ ترا سکہ ہو مانند درم

جمع ہیں ایک تری ذات میں کتنے اوصاف

بذل و انصاف و ہنر پروری و لطف و کرم

راقم کی حقیر رائے میں قصیدہ گوئی کا یہ پُر شکوہ انداز لغت تراشی اور محاورہ بندی نہیں کہلا سکتا۔ 'مہتابِ داغ' اُن کی پختہ خیالی کا منہ بولتا ثبوت ہے اور یہ رنگِ سخن بلاشبہ رام پور کے ادبی ماحول کا کرشمہ ہے۔ رام پور میں داؔغ کی شاعری کے حوالے سے سب سے بڑی خدمت یہ ہے کہ اُنھوں نے عوام الناس میں سے جوہرِ قابل تلاش کر کے اُن کی تربیت کی۔(۱۱)

"داغ کے شاگرد رام پور میں امرانہ تھے، غریب تھے اور اُنھوں نے داغؔ کے نقشِ قدم پر چل کر استاد کی شہرت میں اضافہ کیا اور ہر محفل میں داغؔ کی شاعری کا چرچا ہونے لگا۔"

داغؔ کے ہم عصر تذکرہ نگار بھی اُن کی شوخیٔ فکر اور رنگینیٔ معنی کی تحسین کیے بغیر نہیں رہ سکے۔ مرزا قادر بخش صابرؔ دہلوی(۱۲)لکھتے ہیں:

"ضمیر صافی اور فروغ مشرق اور آفتاب شوخیٔ فکر اور طبع لمعہءبرق اور سحاب، معنی کی رنگینی اور عبارت کی متانت اور الفاظ کی شستگی اور کلمات کی تنگذری حد اوصاف سے خارج ہے۔"

مگر ناقدین میں داغؔ کی شاعری کو رندی اور رنڈی کی شاعری، قرار دینے والوں کی بھی کمی نہیں۔ اعتدال پسند نقادوں نے اُن کے کلام میں خامیوں سے زیادہ خوبیوں کا ذکر کیا ہے اور واقعہ یہ ہے داغؔ کی زباں دانی کے آگے اُن کی چھوٹی موٹی فرد گزاشت پر نظر بھی نہیں پڑتی اور اس کے لیے بھی اُن کے بچپن کا ماحول بہت سا جواز فراہم کر دیتا ہے۔

'مہتاب داغ'میں شامل کلامِ داغؔ زیادہ تر اُن کے قیام رام پور کے زمانے میں تخلیق ہوا ہے۔اس سے مختصر سا انتخاب پیش کیا جاتا ہے۔

روتے روتے وہ تبسّم جو کبھی یاد آیا　　پھر گیا اشک بھی آکر سرِ مژگاں اُلٹا

خیر سے قتل بھی کرنا نہیں آتا اب تک　　حلق پر پھیرتے ہو خنجر برّاں اُلٹا

پڑ گئے لینے کے دینے سرِ محشر ہم کو　　ہو گیا نفع کی امید میں نقصاں اُلٹا

اچھی صورت پہ غضب ٹوٹ کے آنا دِل کا　　یاد آتا ہے ہمیں ہائے زمانہ دل کا

مرے صیاد کو اک کھیل ٹھہرا　　پھنسا کر دام میں آزاد کرنا

فتنہ، فساد، رشک، تغافل، غرور، ناز　　اس کے سوا ہے اور تری انجمن میں کیا

تسخیر جذبِ عشق کی تاثیر الاماں　　جادو ہے آپ کی نگہِ سحر فن میں کیا

مرگِ دشمن کا زیادہ تم سے ہے مجھ کو ملال　　دشمنی کا لُطف، شکوے کا مزا جاتا رہا

حرِص دامن گیرِ دنیا، مالِ دنیا بے ثبات　　جس قدر حاصل کیا، اس سے سوا جاتا رہا

تیرے ہر عضو میں تصویر کا عالم دیکھا　　ہے تنِ صاف عجب آئنہ خانہ تیرا

وعدۂ حشر پہ بے ساختہ دل لوٹ گیا　　عہد کا عہد، بہانے کا بہانہ تیرا

قیامِ دکن کی ایک غزل کا مطلع اور مقطع:

قبضہ کرتا ہے ہر اک حور شمائل اپنا　　آج ہم وقف کیے دیتے ہیں لو دل اپنا

حیدر آباد میں کی قدر ہماری اے داغؔ　　شاد و آباد رہے خسروِ عادل اپنا

۲۳۔مارچ ۱۸۸۱ء کو نواب کلبِ علی خاں وفات پا گئے تو داغؔ نے رام پور کو اسی سال خیر باد کہہ دیا۔

رہے کیا مصطفےٰ آباد میں داغؔ　　وہ سارے لُطف تھے خُلد آشیاں تک

دہلی آکر اُن کی اگلی منزل حیدر آباد دکن تھی۔ ۱۸۸۸ء میں حیدر آباد گئے، تین سال انتظار کیا۔ ۱۹۸۱ء میں نظامِ دکن کے استاد ہوئے اور ۴۰۰ روپے تنخواہ مقرر ہوئی۔ نہات خوشحالی سے بسر ہو رہی تھی کہ ۱۸۹۷ء میں رفیقہء حیات چل بسی۔ حجابؔ کی یاد آئی۔ اُسے بلایا بھی مگر اَب ع

نہ وہ زمانہ رہا اب نہ وہ دلِ پُر دم

حجابؔ مایوس ہو کر لوٹ گئی۔ داغؔ کے متعلقین اُن کے لیے اذیت کا سامان کیے رکھتے تھے اور اُن کی دولت پر دادِ عیش دیتے تھے۔ بالآخر ۱۷۔ فروری ۱۹۰۵ء کو ہاتف نے صدا دی۔

آج راہی جہاں سے داغؔ ہوا　خانہء عشق بے چراغ ہوا

امیر احمد، امیرؔ مینائی:

امیرؔ مینائی(۱۳) انتخابِ یادگار میں اپنا تعارف اِن لفظوں میں کراتے ہیں:

"امیرؔ تخلص ہیچ میرز، ہیچ می دان، امیدوار رحمتِ یزداں امیر احمد ابن مولوی کرم محمد ننگ خاندان مخدوم شاہ مینا دام اللہ برکاتہم فینا، فنِ شعر میں جناب منشی مظفر علی صاحب اسیرؔ کے تلامذہ میں داخل، برائے نام تحصیلِ کتب درسیہ میں اکثر علماءِ نامی کے شاگردوں میں شامل، سرکارِ فیض آثار کا نمک خوار آبائی ہے۔"

امیرؔ مینائی نے اپنی عمر یا سنِ پیدائش نہیں لکھا۔ ڈاکٹر ابو اللیث صدیقی(۱۴) اپنے مقالے میں لکھتے ہیں:

"نصیر الدین حیدر کے زمانہ میں ۱۲۔ شعبان ۱۲۴۶ھ / ۱۸۲۶ء کو امیرؔ مینائی کی ولادت ہوئی اور ابتدائی تعلیم و تربیت والد کی نگرانی میں ہوئی۔"

والد کی خواہش کے مطابق امیرؔ مینائی شاعر سے زیادہ علوم عربیہ کی تعلیم حاصل کرنے میں مشغول رہے۔ مفتی سعد اللہ جیسے جیّد عالم سے بھی فیض یاب ہوئے۔ فارغ التحصیل ہو کر اُنھوں نے اسیرؔ لکھنوی سے استفادہ کیا اور انھی کے توسط سے واجد علی شاہ کے دربار میں پہنچے۔

۱۸۵۲ء میں اُنھیں واجد علی شاہ کے ہاں ملازمت ملی۔ اس دوران میں مشاعروں میں شرکت کرتے رہے اور اِس نو مشقی کے زمانے کا کلام جس میں غزلیں اور قصائد شامل تھے اُنھوں نے 'غیرت بہارستان' کے نام سے مرتب کیا۔ اس کی طباعت نہ ہو سکی کیوں کہ ۱۸۵۷ء کا ہنگامہ واجد علی شاہ کی حکومت اور امیرؔ مینائی کے کلام کی بربادی کا موجب بن گیا۔ دوسرے شرفاء کی طرح امیرؔ کو بھی لکھنؤ سے رخصت ہوتے ہی بنی۔ اسیرؔ اس دوران میں نواب محمد سعید خاں کے ساتھ دیرینہ تعلق کی بنا پر ریاست رام پور سے منسلک ہو گئے تھے۔ انھی کی وساطت سے امیر مینائی نواب یوسف علی خاں کی ملازمت میں آ گئے۔(۱۵)

"رام پور کی ملازمت نہ صرف امیر مینائی بلکہ عام لکھنوی شاعری کی تاریخ میں نہایت اہم زمانہ ہے۔ دہلی اور لکھنؤ کی ویرانی کے بعد یہی ایک دربار ایسا تھا جہاں ہر فن کے

کامل اور امام موجود تھے یہ پہلا موقع تھا کہ دہلی اور لکھنؤ کے شعرا کو ایک ہی محفل میں دادِ سخنوری دینا پڑی۔"

امیرؔ مینائی نے رام پور میں اپنا پہلے دور کا کلام پھر سے جمع کر کے 'مراۃ الغیب' کے نام سے شائع کیا۔ یہاں آکر اُنھوں نے داغؔ اور دیگر ہم عصر شعراء کے ساتھ جن مشاعروں میں شرکت کی وہاں دہلی اور لکھنؤ کے ساتھ ایک تیسرا رنگ رام پور کا تھا جسے تمام نووارد شعرا نے پسند کیا۔ رام پور کے شعری رجحان میں نہ تو دہلی کا نوحہ غم تھا اور نہ ہی لکھنؤ کا نغمہ شادی بلکہ یہاں ایک معتدل رجحان پایا جاتا تھا۔ ۱۸۶۵ء میں نواب یوسف علی خاں کے انتقال کے بعد نواب کلبِ علی خاں کا دَور آیا۔ اَب امیرؔ مینائی کو ریاست کی ملازمت سے سبکدوش کر دیا گیا اور اُنھیں ملک الشعرا کا خطاب دے کر نواب نے اپنے کلام کی اصلاح کا کام سونپ دیا۔

نوابؔ کی فرمائش پر اُنھوں نے تذکرہ بھی لکھا جس کا تاریخی نام انتخاب یادگار ہے اور یہ ۱۸۷۳ء میں مکمل ہوا۔ سر الفرڈ لائل کی فرمائش پر نواب کلبِ علی خاں نے اُنھیں ایک جامع اردو لغت تیار کرنے کی ذمہ داری بھی سونپی تھی مگر نوابؔ کے انتقال کے بعد رقم فراہم نہ ہو سکی اور یہ کام ادھورارہ گیا کیوں کہ جنرل عظیم الدین خاں مدارالمہام کی عدم توجہی سے دل برداشتہ ہو کر امیرؔ لغت نویسی سے الگ ہو گئے تھے۔

۱۹۰۰ء میں دربار سے اجازت لے کر حیدر آباد گئے۔ وہاں جا کر مختصر علالت کے بعد ۱۳۔ اکتوبر ۱۹۰۰ء کو انتقال کیا۔ مراۃ الغیب کے بعد صنم خانہء عشق اُن کے جدید رنگ میں کہے ہوئے اشعار کا مجموعہ تھا۔ ایک مجموعہ واسوخت 'شعلہ جوالہ' کے نام سے ترتیب دیا اس کے علاوہ متعدد کتب، متفرق مضامین پر تحریر کیں شبیر علی خاں شکیبؔ (۱۶) کے بقول:

"داغؔ کی طرح امیر مینائی کو بھی قیامِ رام پور کے دوران شہرت اور درجہ استادی حاصل ہوا۔ رام پور میں ان کے بیسیوں شاگرد ہوئے جو خود آگے چل کر اساتذہ ہوئے۔"

امیرؔ مینائی کے ابتدائی کلام میں ناسخؔ کا انداز نمایاں ہے اور اس میں وہی ابتذال بھی ہے جو کلام ناسخؔ کا عیب سمجھا جاتا ہے۔ دو مثالیں درج کی جاتی ہیں۔

کتنا ہے سخت قلبِ رقیب سیاہ رُو نطفہ یہ شمر کا ہے کہ بچہ یزید کا

مشتاق وصل کون تیرا نازنیں نہیں کُرتی پھنسی کہ لپٹی ہوئی آستیں نہیں

اُن کا دوسرا مجموعہ کلام 'صنم خانہء عشق، رام پور میں قیام کی یاد گار ہے۔(۱۷)

"دورِ رام پور کے کلام میں اعلیٰ تخیل، عاشقانہ مضامین، طرزِ بیان کی سلاست و روانی اور دل کش ترکیبیں بہ کثرت موجود ہیں۔ اس دور کا نعتیہ کلام البتہ قدیم رنگ پر ہے، تاہم اس میں فصاحت وبلاغت اور جوش عقیدت کے بہترین نمونے ملتے ہیں۔"

امیرؔ مینائی کے اس دور میں کہے ہوئے اشعار سے چند مثالیں دی جاتی ہیں۔

وہ مزا دیا تڑپ نے کہ یہ آرزو ہے یارب مرے دونوں پہلوؤں میں دلِ بے قرار ہوتا

جو نگاہ کی تھی ظالم تو پھر آنکھ کیوں چرائی وہی تیر کیوں نہ مارا جو جگر کے پار ہوتا

اِن اشعار کو پڑھتے ہوئے اگر غالبؔ یاد نہ آئیں تو اِن کا لُطف لیا جا سکتا ہے۔

موقوف جرم ہی پہ کرم کا ظہور تھا بندے اگر قصور نہ کرتے قصور تھا

صورت تیری دکھا کے کہوں گا یہ روزِ حشر آنکھوں کا کچھ گناہ نہ دل کا قصور تھا

قریب ہے یارو روزِ محشر، چھپے کا کُشتوں کا خون کیوں کر
جو چپ رہے گی زبان خنجر، لُہوُ پکارے گا آستیں کا
تجھ سے مانگوں میں تجھی کو کہ سبھی کچھ مل جائے
سو سوالوں سے یہی ایک سوال اچھا ہے

اب یوسف حسین خاں کے منتخب کردہ کلام سے کچھ مثالیں لکھی جاتی ہیں:

جب آئی جوش پہ میرے کریم کی رحمت گرا جو آنکھ سے آنسو دُرِ یگانہ ہوا

ہمارے دل سے مٹے گا نہ داغِ شوقِ سجود جبیں رہے نہ رہے آستاں رہے نہ رہے

امیرؔ جمع ہیں احباب دردِ دل کہہ لے پھر التفاتِ دلِ دوستاں رہے نہ رہے

چھوٹی بحر کی یہ غزل بھی امیرؔ کے کمالِ فن کا عمدہ نمونہ ہے جس میں 'لوٹ گئی' کی ردیف نہایت پُر لطف ہے۔

تیغِ قاتل پہ ادا لوٹ گئی رقص بسمل پہ قضا لوٹ گئی

پس گیا چشمِ سیہ پر سُرمہ پائے رنگین پہ حِنا لوٹ گئی
اس روش سے وہ چلے گلشن میں بجھ گئے پھول، صبا لوٹ گئی

دمِ اخیر ہے لازم نظارا کر لینا خدا سے کام پڑا ہے بُتو خبر لینا
امیرؔ جاتے ہو بت خانے کی زیارت کو ملے جو راہ میں کعبہ سلام کر لینا

غیروں سے کبھی ہے، کبھی مجھ سے ہے لگاوٹ بہکی ہوئی پھرتی ہے محبت کی نظر آج
کس لطف سے جھنجھلا کے وہ کہتے ہیں شبِ وصل ظالم تری آنکھوں سے گئی نیند کدھر آج

شوخی تھی قیامت تری مستانہ ادا میں فتنوں نے قدم چوم لیے لغزش پا میں
مشکل ہے مسیحا کو بھی اب جان بچانا نکلی ہے قضا چھپ کے حسینوں کی ادا میں

جب سے بلبل تو نے دو تنکے لیے ٹوٹتی ہیں بجلیاں ان کے لیے
باغباں کلیاں ہوں ہلکے رنگ کی بھیجنا ہیں ایک کم سن کے لیے

امیرؔ مینائی کا یہ شعر آج بھی زباں زدِ خاص و عام ہے۔

خنجر چلے کسی پہ تڑپتے ہیں ہم امیرؔ سارے جہاں کا درد ہمارے جگر میں ہے

رام پور میں داغؔ اور امیرؔ کا یکجا ہونا عطیہء خداوندی ہے جس کے طفیل اردو شاعری کو بالعموم اور رام پور کی اردو شاعری کو بالخصوص فروغ ملا۔

حوالہ جات وحواشی

۱۔ امیرؔ مینائی، امیر احمد۔ انتخاب یادگار، ص۱۲۸

۲۔ کلب علی خاں فائق،(۲۰۰۸ء)مرتب۔ مہتابِ داغ ، مقدمہ از مرتب لاہور، مجلس ترقی ادب، ص ۳۲

۳۔ کلب علی خاں فائق، مرتب۔مہتابِ داغ، مقدمہ از مرتب؛ص ۳۲

۴۔ کلب علی خاں فائق، مرتب۔مہتابِ داغ، مقدمہ از مرتب؛ص ۳۲

۵۔ کلب علی خاں فائق، مرتب۔مہتابِ داغ، مقدمہ از مرتب؛ص۳۹

۶۔ کلب علی خاں فائق، مرتب۔مہتابِ داغ، مقدمہ از مرتب؛ص۲۸

۷۔ نجم الغنی۔ اخبار الصنادید، جلد دوم؛ص۲۰۷

۸۔ شبیر علی خاں شکیبؔ، مؤلف۔ رام پور کا دبستانِ شاعری، ص۳۴

۹۔ سید عابد علی عابدؔ۔ داغ کے کلام پر انتقاد، مشمولہ مہتابِ داغ، کلب علی خاں فائق، مرتب۔ ص ۸۰

۱۰۔ سید عابد علی عابدؔ۔ داغ کے کلام پر انتقاد، مشمولہ مہتابِ داغ۔ ص ۸۰

۱۱۔ نور الحسن ہاشمی، ڈاکٹر۔(۱۹۸۹ء) دلی کا دبستان شاعری، کراچی، اردو اکیڈمی سندھ، ص ۱۶۲

۱۲۔ کلب علی خاں فائقؔ، مرتب۔ مہتابِ داغ ، مقدمہ از مرتب؛ص ۵۱

۱۳۔ امیرؔ مینائی، امیر احمد۔ انتخاب یادگار، ص ۳۳۔۳۴

۱۴۔ ابو اللیث صدیقی، ڈاکٹر۔لکھنؤ کا دبستانِ شاعری، ص۶۴۱

۱۵۔ ابو اللیث صدیقی، ڈاکٹر۔ لکھنؤ کا دبستانِ شاعری، ص۶۴۳

۱۶۔ شبیر علی خاں شکیبؔ، مؤلف۔ رام پور کا دبستانِ شاعری، ص۳۵۹

۱۷۔ ابو سعید نور الدین، ڈاکٹر،(۱۹۹۷ء)،تاریخ ادبیات اردو ، حصہ دوم؛اردو نظم لاہور، مغربی پاکستان اردو اکیڈمی، ص ۶۵۳

❖ References:

1.Ameer Minai, Ameer Ahmad. *Intekhab-e-Yadgar*, P 128

2. Kalb Ali Khan Faiq, (2008) Murattab. *Mehtab Dagh*, Muqamma az murattab. Lahore: Majlis Taraqqi Adab P 32

3. Kalb Ali Khan Faiq, *Mehtab Dagh*, Muqamma az murattab; P 32

4. Kalb Ali Khan Faiq, *Mehtab Dagh*, Muqamma az murattab; P 32
5. Kalb Ali Khan Faiq, *Mehtab Dagh*, Muqamma az murattab; P 39
6. Kalb Ali Khan Faiq, *Mehtab Dagh*, Muqamma az murattab; P 28
7. Najm ul Ghani. *Akhbar ul Sanadeed*, Volume II ; P 207
8. Shabeer Ali Khan Shakeeb, muallif. *Raampur ka dabistan-e-shairi*, P 34
9. Syed Abid Ali Abid. Dagh ky kalam par intiqaad, Mashmoola, *Mehtab Dagh*, Kalb Ali Khan Faiq, murattab P 80
10. Syed Abid Ali Abid. Dagh ky kalam par intiqaad, Mashmoola, *Mehtab Dagh*, P 80
11. Noor ul Hassan Hashmi, (1989) Doctor. Dilli ka Dabistan Shairi, Karachi: Urdu Academy Sindh P 162
12. Kalb Ali Khan Faiq, *Mehtab Dagh*, Muqamma az murattab; P 51
13. Ameer minai, Ameer Ahmad. *Intekhab-e-Yadgar*, P 32-33
14. Abul Lais Siddique , Doctor. *Lakhnau ka Dabistan-e-Shairi* P 641
15. Abul Lais Siddique , Doctor. *Lakhnau ka Dabistan-e-Shairi* P 643
16. Shabeer Ali Khan Shakeeb, muallif. *Raampur ka dabistan-e-shairi*, P 359
17. Abu Saeed Noor-u-Deen, (1997) Tareekh-e-Adbiyat Urdu, Part II; Urdu Nazm Lahore: Maghrabi Pakistan Urdu Academy, P 653